۴

تہذیب اسلامی کو درپیش علم و دانش کا چیلنج

[اکیسویں صدی کے بارے میں ایک پیش بینی]

ہمارا موضوع نہ صرف مستقبل کے چیلنجوں سے متعلق ہے بلکہ خود یہ موضوع بھی ایک چیلنج ہے، کم از کم اس حد تک کہ یہ مجھ سے بہ رنگ نبوت پیش گوئی کرانا چاہتا ہے۔ گزارش ہے کہ ایسا کرنا کسی بھی مسلمان کے لیے بہت صبر آزما ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی واحد و یکتا ذات ہی سارے حوادث و واقعات پر قدرت رکھتی ہے۔ چنانچہ میں آخر میں چل کر ہی نہیں ابھی اسی مرحلے پر اعتراف کرتا ہوں: واللہ اعلم۔

مستقبل کے اندازے لگانا خطرے سے خالی نہیں۔ ایسا کرنا اس صورت میں اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے جب ماضی پر نظر ڈالے بغیر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اگر کوئی ایسی بنیاد موجود ہے جس پر آئندہ کے اندازے قائم کیے جا سکیں تو وہ تاریخ ہے یا اس کا اسلوب اور اس کے اسباق ہیں۔

تاریخ اسلامی کا ورثہ

ہمیں اپنے موضوع کے لیے اسلامی تاریخ سے کچھ لازمی استنباط کرنا ہیں۔

ا۔ اسلامی تاریخ ہمیشہ تعقل اور خردمندی سے مرکب رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب [القرآن] میں انسانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ مشاہدہ کریں، تلاش و جستجو اور غور و فکر سے کام لیں، اور اپنی عقل و دانش کی صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ تاکہ اس دنیا کو اور

اس میں اپنی حیثیت کو سمجھ سکیں۔ حقیقت میں قرآن پاک وہ واحد کتاب مقدس ہے جس نے ایسا کوئی حکم دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اسلام آغاز سے ہی اپنی بہترین صورت میں عقل و دانش کے اعتبار سے پسندیدہ مذہب رہا ہے۔ اس عقیدے کا عقلی لحاظ سے پسندیدہ ہونا اور ذہنی اعتبار سے معقولیت پر مبنی ہونا ہی پہلی صدی ہجری میں اسلام کی تیز رفتار توسیع و اشاعت کا باعث بنا۔

۲۔ اسلام نے ابتداء سے ہی ذهنی تربیت کا اهتمام کیاهے۔

یہ درست ہے کہ اسلام ایک مذہب ہے نہ کہ فلسفہ، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم الٰہیات کے پروفیسر نہیں بلکہ ایک پیغمبر ہیں۔ تاہم اسلام نے آغاز سے ہی علمی و ذہنی سرگرمیوں کا مطالبہ کیا ہے۔ شروع میں زیادہ توجہ وحی (قرآن) و سنت کی جمع و تدوین پر اور اس کام کو منظم و مرتب کرنے پر دی گئی۔ اس تناظر میں حسن البصری، مالک بن انس، ابن اسحاق، البخاری، الطبری جیسے مسلمانوں اور ان کے رفقاء نے تاریخ نویسی اور لسانیات اور قانون سازی کے علم کو اپنے انتہائی درجے پر پہنچا دیا۔

۳۔ قریباً پانچ سو سال تك اسلام عالم انسانیت کا ذهنی قائد رها

دمشق، بغداد، لاہور، قرطبہ، سیولا، غرناطہ، الفسطاط، قیروان اور فاس (Fes) میں تہذیب اسلامی کی ترقی کی کہانی غیر معروف نہیں۔ قدیم یونان نے جو ذہنی و علمی معجزہ دکھایا تھا، مسلمان اس کے امین و محافظ بن گئے اور انہوں نے کلاسیکی ورثے کی تجدید و ترقی کے ذریعے اپنا عربی معجزہ کر دکھایا۔ یورپ میں تحریک احیائے علوم سے جو ذہنی ترقی اور موشگافیاں ہوئیں، وہ ابن سینا، ابن رشد، البیرونی، الخوارزمی، ابن ہیثم، ابن بطوطہ اور ابن خلدون کے بغیر ناقابل تصور ہیں۔ یہ سب افراد تاریخ انسانی کے نابغوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۴۔ اسلامی روایت پسندی غیر عقلی نهیں

یہ کہنا غلط ہوگا کہ ابن حنبل، الاشعری، ابن حزم یا ابن تیمیہ جیسے لوگ روایت پسند ہونے کی بنا

پر عقل دشمن تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کانٹ یا وٹگنسٹین کو مابعد الطبیعات کے امکانی وجود سے انکار کی بنا پر عقلیت پسندی کا مخالف قرار دے دیں۔

یہ درست ہے کہ ابن حنبل نے مسلمانوں کے عقیدے کو یونانی فلسفے سے بچانے کی کوشش کی اور الاشعری نے نظریہ علم پر اپنی سخت تنقید کے ذریعے مابعد الطبیعاتی استنباط (اخذ نتائج) کے امکانات کو رد کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ ابن حزم نے قرآن کی مشکل (متشابہ) آیات کی بہتر تفہیم کے لیے قرآنی معیار و قاعدے میں توسیع اور تفسیر کے لیے ''قیاس'' کے طریقے کو رد کر دیا تھا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ابن تیمیہ نے اسلام میں صوفی حلقوں کے ذریعے نو افلاطونیت اور غناسطیت * کے جڑ پکڑنے کی مذمت کی تھی۔ لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنے دعوے کی بنیاد ذہنی و عقلی تجزیہ و تحلیل پر رکھی تھی۔ اپنے پیشرو الغزالی کی طرح انہوں نے بھی اپنے مخالفین کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا تا کہ ان کا بہتر مقابلہ کیا جا سکے۔

۵۔ تعقل پسندی کا مطلب تکثیریت ھے

اسلام کا آغاز ایک ایسے دور میں ہوا جب سیاسی اور ثقافتی فضا میں عدم برداشت اپنے عروج پر تھی۔ ایسی ہی عدم برداشت جس کا مظاہرہ عیسائی کلیساؤں کی باہمی رقابت میں ہوا تھا جیسے رومن کیتھولک عیسائیوں کی رقابت آرتھوڈکس عیسائیوں کے ساتھ اور آرتھوڈکس عیسائیوں کی آریاؤں، نسطوریوں، آرمینیوں اور قبطیوں کے ساتھ۔ سیاسی طور پر دنیا میں بادشاہوں کی حکمرانی تھی جنہوں نے موروثی طور پر یا تلوار کے ذریعے اقتدار حاصل کیا تھا۔

اس کے بالکل برعکس مسلم دنیا میں اصل ذہنی اور عقلی رویے کے مطابق تکثیریت کے ساتھ ترقی کا عمل انجام پایا۔ حضرت ابوبکرؓ اپنی سلطنت کے پہلے قائد تھے جنہیں اپنے پیش رو (حضرت

---

* غناسطی۔ قدیم عیسائیوں کے بعض فرقوں میں سے کسی فرقے کا رکن جو روحانی علم میں برتری کے دعوے دار تھے۔ گیانی، عرفانی۔

محمدؐ) سے کسی خونی رشتے کی بجائے انتخاب کے ذریعے قیادت نصیب ہوئی تھی۔

اسلامی فلسفہ قانون (قانونیات) میں نصف درجن کے قریب فقہی مکاتب (مذاہب) نے نہ صرف علاقائی طور پر، بلکہ (جیسے مکہ میں) بیک وقت سب کی تعلیم دی جاتی رہی۔ یہ علم ودانش کا ایک ایسا کارنامہ (intellectual feat) ہے جس کی مثال اس سے پہلے یا بعد کے کسی نظام قانون میں نہیں ملتی۔

درحقیقت مغربی مستشرقین اس وقت غلطی کرتے ہیں جب وہ اسلام کے بارے میں زمان و مکان کے حوالے سے ایک یک رنگ، یک سنگ، جامد اور غیر متغیر مذہب ہونے کا تاثر دیتے ہیں۔ جبکہ سوائے توحید باری تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے [اسلام میں شامل] ہر چیز پر بحث کی جاسکتی ہے، بشمول ایمان کے دیگر چار ارکان کی ظاہری شکل وصورت اور طریقوں کے۔ تقلید کے تصور نے --- جو بذاتِ خود مکمل غیر عقلی ہرگز نہیں ہے --- عقیدہ، عبادت اور معاملات کی حدود سے آگے بڑھ کر تحقیق واختراع کا راستہ روکا اور اس طرح [اسلام کو] ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ لیکن اس کے باوجود تقلید کے دور میں بھی مسلم دنیا میں (شیعیت سے باہر بھی) ذہنی ارتقاء کا سفر جاری رہا۔ اس کا ثبوت ابن عربی، سرہندی، شاہ ولی اللہ اور محمد ابن عبدالوہاب کی شخصیتوں میں ملتا ہے۔

فلسفے میں ذہنی جھڑپیں بہت شدید رہیں، اتنی شدید کہ آج کی فوجداری عدالتوں میں ان پر ہتک عزت، توہین اور تہمت کے مقدمے چلائے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف فلسفے پر الغزالی کی شدید تنقید ''التہافت الفلاسفہ'' اور اس پر ابن رشد کا اتنا ہی سخت جواب ''التہافت التہافت'' کا مطالعہ کرکے دیکھ لیں۔ کتنی جان بخش اور امید افزاء ہے یہ اختلاف رائے۔ جیسا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے رحمت سے تعبیر فرمایا۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر آج ابن رشد زندہ ہوتے اور اپنے خیالات کو از سر نو شائع کرتے تو بہت ممکن ہے کہ کسی آج کے انتہا پسند مسلمان

کے ہاتھوں اللہ کے نام پر مارے جاتے۔

۶۔ تکثیریت کے فقدان کا مطلب زوال ہے۔

اگر میں اس بات سے انکار کروں کہ اسلام میں ہمیشہ تکثیریت نہیں رہی تو خیانت کا مرتکب ٹھہروں گا۔ عائشہؓ اور علیؓ، علیؓ اور معاویہؓ اور علیؓ اور خارجیوں کے درمیان شدید بلکہ خون آشام جھگڑے ہوئے۔ ایسی ہی نوعیت امویوں اور عباسیوں، معتزلہ اور اشعریوں، سنیوں اور شیعوں، عبادی اور علوی مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی ہے۔ اسی طرح الحلاج کے معاملے میں صوفی انتہا پسندی کو سختی سے کچل دیا گیا۔

تاہم یہ واضح ہے کہ اسلام کو ایک ہی مذہب یا فقہ اور فرقے کے مطابق ڈھالنے کی یہ کوششیں نہ صرف اس کے ذہنی ارتقاء، گنجائشوں، کثرتوں اور رواداری کو تباہ کرنے کا باعث بنیں بلکہ انہی کی بنا پر زوال کا ایسا دور شروع ہوا جس سے ہم بہ مشکل حال ہی میں آ کر سنبھل رہے ہیں۔

یقیناً مسلمانوں کے زوال کی اور بھی کئی وجوہات ہیں جن میں منگولوں کی جارحیت کے باعث ہونے والی ثقافتی تباہی اور سپین میں کیتھولک عیسائیوں کی فتح نو بھی شامل ہے۔ سیاسی اور معاشی عدم تحفظ نے مسلمانوں کو ذہنی پستی کی طرف دھکیل دیا۔ انہوں نے مذہب کو نجی، شخصی اور انفرادی معاملہ بنا دیا اور اسی تصور کی ترویج کی اور اسے فروعی تفصیلات میں انتہائی سخت، غیر لچک دار سانچے میں ڈھال دیا۔

اس طرح پوشیدہ رہ کر مغربی اور سوویت استعماریت میں حتیٰ کہ البانیہ، الجزائر، قزاقستان، ترکمانستان، چیچنیا، کوسووا اور چین تک میں اسلام کے زندہ رہنے کی صورت پیدا ہوئی۔ یہ معاملے کا اچھا پہلو ہوا لیکن بری خبر یہ ہے کہ یوں دفاعی صورت میں رہنے سے اسلام سیاسی طور پر غیر متعلق ہوتا چلا گیا اور اس کی بڑھتی ہوئی قانون سازی محض تالمودی ہو کر رہ گئی۔ اس عمل میں صوفی ازم انحطاط پذیر ہو کر دیہاتی طرز کے اسلام (folksy sort of Islam) میں تبدیل ہو گیا جس کی

رسوم پرستی نے اس کی حقیقی روحانیت کو بھی بس رسمی بنا دیا۔

اسلام کے زوال کا ایک اور سبب یقیناً سیاسی ہے: مطلق العنان حکمرانوں نے مذہبی تنقید کو سختی سے دبا دیا اور مطلق العنانیت اسلامی دنیا کی طرز حکمرانی بن کر رہی۔ ان حکمرانوں نے اپنے انتظامی قوانین (التعزیر) مرتب کر کے نہ صرف اپنے علماء سے نجات حاصل کی بلکہ شریعت سے بھی اپنے آپ کو آزاد کرالیا۔ یہ روک ٹوک متابعت میں تبدیل ہوئی۔ بالآخر بیسویں صدی میں نوجوان طبقے نے علماء کو رد کر دیا اور تحاریک اسلامی میں خود کو منظم کرنا شروع کیا۔

قصہ مختصر ہمارے پاس قیمتی ورثہ موجود ہے جس سے اکیسویں صدی میں اسلامی تعقل پسندی کی بار دگر روشن ہوتی ہوئی شمع کے لیے انحصار کیا جا سکتا ہے۔

آج کا منظر نامہ

یہ تھا ہمارا ماضی لیکن حال کیا ہے؟

ہم عصر دنیا کو پہلی بار کسی ایک واحد تہذیب یعنی مغربی تہذیب نے اپنی ثقافتی نوآبادی بنا لیا ہے۔ اپنی اصل میں یہ یورپی تہذیب ہے جس نے امریکی طرز زندگی، مغربی فکر، مغربی ٹیکنالوجی، مغربی مصنوعات اور طور طریقوں کو پوری دنیا میں رائج و مقبول کر دیا ہے۔ یہ عمل گزشتہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) سے جاری ہے اور اس کی دانشورانہ بنیادیں یورپی روشن خیالی (European Englightement) کے عہد میں پیوست ہیں، جسے جدیدیت (Project Modernity) بھی کہا جاتا ہے۔

اس عمل کے دوران دنیا نے عالمی طور پر واحد زبان یعنی انگریزی کا استعمال شروع کر دیا۔ یونانی، لاطینی یا عربی زبان کو یہ درجہ کبھی بھی حاصل نہ ہو سکا تھا۔

سوائے اس تہذیب کی وسعت اور پھیلاؤ کے باقی سب چیزیں چنداں اہم نہیں کہ غالب تہذیبیں خود بخود پھیلتی جاتی ہیں جیسے پانی ہمیشہ بلندی سے پستی کی طرف بہتا ہے۔ اہم اور خصوصی

بات یہ ہے اور تباہ کن حد تک، کہ مغربی نظریہ حیات بھی اسی طرح روئے زمین پر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ پہلا ایسا نظریہ ہے جس کی بنیاد مکمل طور پر ملحدانہ مفروضوں پر ہے۔ مابعد الطبیعات پر کانٹ کی تنقید اور خدا کے وجود کا انکار، مارکس کا مذہب کو ''لوگوں کے لیے افیون'' قرار دے کر بدنام کرنا اور ظالمانہ سماجی ڈارون ازم جس کی تبلیغ نٹشے نے کی، ان سب کا آج عام چلن ہے جنہیں جنگ عظیم اول، سٹالن ازم، قتل عام، جنگ عظیم دوم، ڈریسڈن اور ہیروشیما، ماؤ ازم اور نسلی تطہیر جیسی مغربی تباہیوں نے خوف ناک انداز میں ثابت بھی کر دیا ہے۔ تاہم جدید منظر نامہ کچھ اور خصوصیات سے بھی عبارت ہے:

- مابعد نیوٹونین جدید فزکس، جس کے متعارف کرانے والوں میں پلینک، آئن سٹائن، ہان اور ہیزنبرگ شامل ہیں۔
- جدید ریاضی جسے فریگ نے متعارف کرایا۔
- جدید مائیکرو بیالوجی اور ادویہ، اور
- جدید کمیونیکیشن ٹیکنالوجی۔ بل گیٹس کے آلات۔

مستقبل میں توقعات ـــــ چند مفروضے

ماضی اور حال پر نظر ڈالنے کے بعد ہم اسلام کے مستقبل کے بارے میں کیا توقع کر سکتے ہیں؟

مفروضہ اول: اسلام کی عالمی حیثیت

کمیونی کیشن کے انقلاب کو دیکھتے ہوئے، اسلام جو ہمیشہ سے عالمی [دین] ہونے کا دعوے دار رہا ہے، اکیسویں صدی میں بالفعل عالمی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ مسلمان دانش ور انٹرنیٹ پر پہلے ہی آموجود ہوئے ہیں۔

مفروضہ دوم: دعوۃ کے نقطہ نظر سے اسلام کی بڑی زبان انگریزی ہو گی۔

اگر آپ کو اس میں شک ہے تو *The Muslim World Book Review* کا کوئی سا

شمارہ اٹھا کر دیکھ لیں، یا برادر اسحٰق [ظفر اسحٰق انصاری] سے پوچھ لیں کہ وہ *Islamic Studies* کو انگریزی میں کیوں چھاپتے ہیں۔

مفروضہ سوم: مسلمان اہل علم/ دانشور مغرب کا رخ کریں گے۔

صاف ظاہر ہے کہ دانشور اور سائنس دان ایسے علمی ماحول کی تلاش میں ہوتے ہیں جو ان کی تحقیق میں مدد و معاون ہو۔ اس طرح وہ جگہیں بے حد اہمیت اختیار کر جاتی ہیں جہاں علمی و تحقیقی آزادی میسر ہو اور کسی کو، دوسروں کی نظر میں، اپنے متنازع افکار کی اشاعت پر انتقام کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ قابل اور اہل علم مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی یورپ، امریکہ اور کینیڈا کی طرف ہجرت کر چکی ہے۔ پروفیسر محمد حمید اللہ، فضل الرحمٰن، محمد اسد، فتحی عثمان، طٰہٰ جابر الالوانی یا راشد الغنوشی، ان میں سے محض چند نام ہیں۔ یہ حیرت کی بات نہیں کہ فطری علوم (natural sciences) میں پہلا نوبل انعام جو ۱۹۹۹ء میں کسی سنی مسلمان کو دیا گیا ایک مصری کو ملا جو جرمنی اور امریکہ دونوں جگہوں پر کام کرتے ہیں۔

مفروضہ چہارم: غیر روایتی دانشوروں کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

ماضی میں کچھ علماء اور حکومتوں کے ساتھ ان کی ساز باز نے (غیر روایتی) اصلاح کاروں کو نمایاں کیا ہے۔ الافغانی، حسن البنا، سید قطب، محمد اسد، محمد اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی، عباس مدنی اور اسلامی تحریکوں کے دیگر قائدین، سب کا شمار غیر روایتی علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے علماء کے کسی روایتی مکتبہ فکر سے تربیت نہیں پائی۔

جرمنی میں مسلمانوں کی مرکزی کونسل کے سربراہ ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ امریکہ میں بھی مراکز اسلامی کی اکثریت کو شاید میڈیکل ڈاکٹر ہی چلا رہے ہیں۔ *CAIR کے سربراہ سانتا کلارا میں ایک کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ لاس اینجلس کی اسلامک انفارمیشن سروسز کے سربراہ ہارورڈ کے تربیت

* Council on American - Islamic Relations, Washington DC.

یافتہ ایک یورالوجسٹ ہیں۔ اس رجحان میں مسلسل اضافہ ہوگا اور اس کے ذریعے پیشہ ور اور مقدس طبقہ علماء اور باقاعدہ اداراتی چرچ سے آزاد، اسلام کے قدیم مثالی تصور کو پھر ابھرنے کا موقع ملے گا۔

مفروضہ پنجم: مسلمانوں میں "مستغربین" پیدا ہوں گے۔

مدینہ میں مسلمانوں کے یہودیوں سے رابطے تھے اور عیسائی بھی عرب کے اندر زیادہ دور نہیں بستے تھے۔ اس بنا پر دیگر توحیدی مذاہب کے بارے میں معلومات مقامی سطح پر مہیا تھیں۔

بعد میں سوائے سپین اور سسلی کے، مغربیوں اور مشرقیوں کے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جانے کی وجہ سے یہ صورت حال نہیں رہی، جب سے جان آف دمشق نے اسلام کو بدنام کرنا شروع کیا تھا، عیسائیوں میں مستشرقین کا وجود رہا ہے جبکہ مسلمانوں میں اس وقت تک عیسائیت پر متخصصین موجود نہیں تھے جب تک بیسویں صدی میں عیسائیوں کی بڑی تعداد نے دائرہ اسلام میں آنا شروع نہیں کیا۔ اب مسلم اہل علم کے لیے اس میدان میں نادر موقع ہے

مفروضہ ششم: مسلمان سنت کے مسئلے کا حل نکالیں گے۔

یہ بات صریحاً واضح ہے کہ مسلمانوں کو قرآن کے حوالے سے کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ لیکن سنت کا مسئلہ ضرور موجود ہے۔ گولڈزیہر (Goldziher)، مارگولیتھ (Margoliuth) اور شاخت (Schacht) اپنے مکمل متشکک رویے کی بنا پر درست نہیں تھے لیکن جب وہ یہ کہتے تھے کہ احادیث کے کچھ حصوں پر سوال اٹھائے جاسکتے ہیں، تو وہ مکمل طور پر غلط بھی نہیں ہیں۔

فضل الرحمٰن نے اس صورت حال کے اہم اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب *Islamic Methodology in History* میں شاید وہ بڑی وجہ سمجھ لی تھی کہ امام شافعیؒ کے زمانے سے مسلمان اپنے تمام موجود ذخیرۂ سنت کو پیغمبر کی طرف لوٹانے میں خود کو پابند محسوس کرتے تھے۔ خواہ اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

تاریخی تنقید کی جدید طریقیات (methodology) سے لیس، جس میں کمپیوٹر کے ذریعے لسانیاتی تجزیہ کرنا بھی شامل ہے، اکیسویں صدی میں مسلمان علماء اور دانشور اس قابل ہوں گے کہ اپنے ''سنت'' کے بیشتر ذخیرے کو کمال استناد تک پہنچا دیں۔

مفروضہ ہفتم: اگر سنت کے مسائل کو حل کر لیا گیا تو مسلمان اہل علم اسلامی ریاست اور معیشت کا ایسا قابل عمل، قابل یقین اور باوثوق ماڈل پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس میں حقوقِ انسانی بالخصوص حقوقِ نسواں کے تحفظ کی یقین دھانی بھی شامل ہو گی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وفاقی جمہوریہ مدینہ کا جو آئینی معاہدہ (میثاق مدینہ) نافذ فرمایا، اس کے بعد مسلمانوں نے ریاست اور حکومت کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کم ہی ذہنی کدو کاوش کی ہے۔ بس الماوردی اور نظام الملک کی استثنائی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

آج کے دانش وروں کو ایک مختلف طرح کا چیلنج درپیش ہے۔ انہیں ''اسلامی جمہوریت'' کی علمی و نظریاتی بنیادوں کو نئے سرے سے اٹھانا ہے۔ انہیں لازماً ایسا کرنا ہوگا اور وہ ایسا کر بھی سکتے ہیں یعنی ایک ایسی ریاست کا قیام جو نہ تو شیعی مفہوم میں مذہبی ریاست ہو، نہ ہی بادشاہی اور نہ ہی شریعت کی پابندیوں سے آزاد سماج۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں حقوق انسانی کے مغربی عقیدے کو جذب کرنے کے علمی چیلنج سے عہدہ برا ہو کر اسے اسلامی اصول قانون کے احاطہ عمل میں لانا ہوگا۔ اس چیلنج کا ایک حصہ دنیا بھر میں مسلمات (مسلمان خواتین) کے قرآنی حقوق کی بحالی سے متعلق ہے۔ اور آخری اہم بات یہ کہ سورۃ النساء کی آیات ۳ اور ۳۴ اور البقرہ کی آیت ۲۲۸ کی تشریح و تعبیر نئے سرے سے کرنی ہوگی۔

مفروضہ ہشتم: مسلمان دانشور مسلمان ذمّی کے درجے (سٹیٹس) سے متعلق قانونی ضابطہ وضع کریں گے۔

غیر مسلم ممالک میں لاکھوں مسلمانوں کی موجودگی ایک ایسا مسئلہ ہے جو اس سے پہلے اسلامی تاریخ میں حتیٰ کہ سپین پر کیتھولک عیسائیوں کے دوبارہ قبضے کے بعد بھی پیش نہیں آیا۔ صرف ہندستان میں برطانوی راج کے دور میں یہ مسئلہ اتنی بڑی حیثیت میں سامنے آیا۔

ان تارکین وطن مسلمانوں کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ وہ غیر ملکی قانون کے تحت شادی اور طلاق، وراثت اور تدفین، حلال ذبیحہ اور ربا جیسے مسائل میں کیسا رویہ اختیار کریں؟ ہمیں ان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے لیے ایک باقاعدہ فقہی مذہب وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

مفروضہ نہم: مغربی مسلمان دانشور دعوۃ کے نئے طریقے بروئے کار لائیں گے۔

۲۰۰ سال سے مسلم دنیا کو فوجی، صنعتی اور تجارتی اصطلاحوں میں دور تعقل کے نتائج بھگتنا پڑے ہیں اور یہ سمجھے بغیر کہ عقلیت پسندی، سائنٹزم اور ترقیات کے ان مغربی مظاہر کا علمی و ذہنی پس منظر کیا ہے، جنہوں نے جدیدیت (modernity) کی تشکیل کی ہے۔

آج کچھ تو نوآبادیاتی طاقتوں کی تعلیمی کوششوں نیز مغرب کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کے طفیل ایسے مسلمان دانشوروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو مغربی نظریے کو اس کے اپنے میدان میں اس کے اپنے قواعد کے تحت شکست دے سکتے ہیں۔

یہ شائد سب سے بڑا چیلنج ہے کہ ''روشن خیال عقلیت پسندی'' کے بنیادی مغالطے اور اس حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کو دور کیا جائے، جو اسے انسان کی عقل، پختگی اور آزادی کے ضمن میں لاحق ہے۔ دوسرے لفظوں میں نام نہاد خود مختار انسان کے سر سے تاج حکمرانی اتارا جائے اور جدید فلسفے اور سائنس کے بنیادی مفروضات سے کامل مطابقت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر ایمان کو بحال کیا جائے۔

مسلمان دانش ور ڈیکارٹ، کانٹ، ہیوم اور کومٹے کے افکار سے مستفید ہوں لیکن مارکس، ڈارون، فرائیڈ اور نٹشے سے مختلف نتائج تک پہنچیں۔ ان کے کرنے کا کام یہ ہے کہ (۱) الحاد کے

عقلی جواز کی غیر موجودگی (۲) مادہ پرستی کے تضاد اور (۳) خدا کے وجود کے یقینی امکانات کو اجاگر کر کے ایمان کے عقلی طور پر درست ہونے کو سامنے لایا جائے۔

مفروضہ دہم: مسلمان دانشور معذرت خواهانه رویه ترك كر دیں گے۔

جس عمل کی وضاحت میں نے کی ہے اس کی تہہ میں ایک مفروضہ ہے اور نتیجتاً ایسا ہوگا کہ ایسے مسلمان دانشور سامنے آئیں گے جو معذرت خواہی ترک کر کے فعال رویہ اختیار کریں گے۔ اس سلسلے میں اکیسویں صدی کے مسلمان، نپولین کے ماتحت اپنے مصری بھائیوں سے ۲۰۰ سال اور محمد عبدہ کی معذرت خواہیوں سے ۱۰۰ سال آگے ہیں۔

مفروضہ یازدہم: تمام مسلمان دانشوروں کی ضرورت ہے کہ وہ واقعی دانش مند ہوں۔

جو کچھ میں نے اب تک کہا ہے اس سے شائد یہ سمجھ لیا جائے کہ مسلمان دانش وروں کو کوئی بہت ہی خاص کردار ادا کرنا ہے۔ یقیناً انہیں خصوصی کردار ادا کرنا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لازماً کسی مسلمان تحریک کے سرگرم کارکن (Muslim Activist) ہوں۔ معاملہ اس سے یکسر مختلف ہوگا۔ اتنے لمبے عرصہ تک اسلام کو غریبوں، تیسری دنیا کے پس ماندہ ممالک اور غیر تربیت یافتہ مزدور کارکنوں سے منسلک عقیدہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ اب یہ گمان کیا جا رہا ہے کہ یہ دین صرف ذہانت سے فروتر افراد کے لیے ہے۔

چنانچہ یہ اشاعت اسلام کے لیے ایک بڑی خدمت ہوگی اگر مسلمان دانش ور خود کو بیک وقت کامیاب اہل علم اور ساتھ ہی [اپنے عقیدے کے] قائل اور باعمل مسلمان کی حیثیت سے پیش کریں۔ مجھے اور دیگر جرمن مسلمانوں کو صرف اسی مرض کی وجہ سے سخت ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا ہے کہ ''بھلا اعلیٰ تعلیم کے باوجود ہم میں سے کوئی اتنا احمق کیسے ہوسکتا ہے کہ اس مذہب [اسلام] کو اختیار کرلے''۔

مفروضہ دوازدہم: اسلام اکیسویں صدی کا برتر مذہب بن جائے گا۔

اگر میرے گیارہ مفروضے درست ہیں تو بارہویں اور آخری مفروضے کے طور پر آسانی سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو، مسلمان اہل علم اور دانش وروں کی مساعی کے طفیل اسلام اکیسوی صدی کا برتر مذہب بن جائے گا۔ کم از کم امریکی طرزِ زندگی کے مرکز شمالی امریکہ میں اور یورپ کے کچھ حصوں میں بھی پھر باقی دنیا پر اس کے بڑے گہرے اثرات خود مرتب ہوں گے۔

آخر میں آپ لوگوں کے صبر و سکون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس اعادے کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں: کہ واللہ اعلم۔

---

*یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی-اسلام آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی میں منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا۔